اداریہ

ہمارے ہاں یہ بات کم و بیش مان لی گئی ہے کہ پاکستانی سماج کو جارحانہ مذہبی شدت پسندی، عدم رواداری اور خون آشام فرقہ پرستی کے جن تہذیبی امراض نے گھیر رکھا ہے اور ہماری انفرادی اور قومی دونوں قسم کی زندگیوں کو برباد کر رہے ہیں، ان سے نجات پانے کے لیے تصوف سے مدد مل سکتی ہے۔ یہ خیال محض خانقاہی حلقوں تک محدود نہیں۔ درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے جدید تعلیم یافتہ دانش وروں اور مذہبی امور سے عموماً بے نیاز رہنے والے حلقوں اور حتیٰ کہ حکمران طبقوں میں بھی اس خیال کو مؤثر مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ چنانچہ جنرل مشرف صاحب نے اپنے اقتدار کے آخری برسوں میں جس اعتدال پسندی کے نظریے کا پرچار شروع کیا تھا، اُس کو روایت کا سہارا دینے کے لیے تصوف کی طرف دیکھا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں قومی صوفیانہ کونسل وجود میں آئی اور ابتدا میں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کافی متحرک بھی ہے۔ کونسل کے زیرِ اہتمام ایک دو بین الاقوامی کانفرنسیں بھی منعقد ہوئیں۔ مگر سرکاری سرپرستی سے نظریاتی مقاصد حاصل نہیں ہوا کرتے۔ اس لیے کونسل کا معاملہ جلد ہی ٹھپ ہو گیا اور وہ بین الاقوامی اقبال انسٹی ٹیوٹ بھی چند ماہ کے بے جان تماشہ کے بعد ہوا میں تحلیل ہو گیا جس کے لیے مرعوب کن فنڈز مہیا کیے گئے تھے۔ یہ ناکامیاں اپنی جگہ ہیں۔ لیکن اس نقطۂ نظر کی مقبولیت کم نہیں ہوئی کہ تصوف کی مدد سے ہم معاشرے میں اعتدال پسندی کے احیا میں مدد لے سکتے ہیں۔

کیا تصوف واقعی اعتدال پسندی اور رواداری کا سبق دیتا ہے؟ کیا ہم اُس سے آج

کے ایک ناتواں مگر ناراض سماج کو صحت مند معاشرہ بنانے کے لیے مدد اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ ایک علمی سوال ہے اور علمی انداز میں ہی اس کا جواب تلاش کرنا چاہیے۔ المعارف کے صفحات اِس موضوع پر اہلِ علم کی تحریروں کے منتظر ہیں۔